ایم۔ اے۔ او کالج کے سب سے پہلے ناظم دینیات

# مولانا عبداللہ انبہٹوی

مفتی نورالحسن راشد

انبہٹہ ضلع سہارن پور، مغربی یوپی کا ایک خاصا معروف قصبہ ہے، تقریبًا سوا چھ سو سال قبل فیروز شاہ تغلق کے وزیر سعد اللہ بیگ نے ۷۷۴ھ میں فوج کے پڑاؤ کے لیے اس کی بنیاد رکھی، اور اپنے ولی نعمت فیروز شاہ کے نام پر اس کو فیروز آباد کے نام سے موسوم کیا، کچھ وقت گزرنے کے بعد جب اس علاقہ اور اس کے اطراف میں کثرت سے زراعت اور پیداوار ہونے لگی تو اس بستی کو "انبانا" کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ انبانا چمڑے کی اس مشک کو کہتے ہیں جس میں غلہ بھرا اور محفوظ کیا جاتا ہے، انبانا کثرت استعمال سے بگڑ کر انبہٹہ ہوا، اور آج تک اسی نام سے مشہور ہے۔ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ اصل قدیم بستی اَمْ ھٹّہ کے نام سے معروف ہوگی، کیوں کہ جس طرح یہاں اجناس اور غلّہ کی پیداوار کثرت سے تھی اسی طرح آم بھی بڑی تعداد میں ہوتے تھے[1]

انبہٹہ مردم خیز خطّہ ہے علم وعمل سے اس کا رشتہ خاصا پرانا ہے۔ اس قصبہ کی قدیم علمی تاریخ کا احوال دریافت نہیں لیکن دو ڈھائی سو سال سے یہاں علم و اخلاص کی بُو رچی بسی ہوئی نظر آتی ہے، یہاں متعدد اہل علم اور اربابِ کمال پیدا ہوئے جن سے علم و اخلاص نے جلا پائی اور فکر وعمل کے چراغ روشن ہوئے، ایسی برگزیدہ و نامور شخصیتوں میں حضرت شاہ ابو المعالی انبہٹوی متوفی ۱۱۱۲ھ یا ۱۱۱۶ھ سر فہرست ہیں، بعد کے دور میں قاضی محمد سالار، مولانا سخاوت علی، مولانا صدیق احمد، مولانا مشتاق احمد اور مولانا خلیل احمد محدث سہارن پوری وغیرہ کی وجہ سے انبہٹہ کی عزت و شہرت میں چار چاند لگے، خصوصًا موخر الذکر شخصیت حضرت مولانا خلیل احمد کو سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اور مولانا کی تالیف بذل المجہود شرحِ سنن ابوداؤد کی شہرت ہند و پاک سے نکل کر تمام عرب ملکوں اور یورپ و افریقہ تک پہنچی اور ہندوستانی مسلمانوں اور علمار کے عزت و وقار کا سبب بنی، انبہٹہ میں علم وفضل کی فراوانی اور شعر و سخن کا ذوق ساتھ ساتھ پروان چڑھا انبہٹہ کے ارباب شعر و سخن میں بھی متعدد نام یادگار ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ سب سے زیادہ اہم اور یادگار شخصیتیں منشی منور علی خنداں، دینا شاہ حافظ اور مولوی علی احمد انبہٹوی کی ہیں، خنداں ذوق کے اخص تلامذہ میں ہیں، مجموعۂ کلام اور ایک واسوخت گلدستہ خنداں کے نام سے شائع ہوا ہے، اور مولوی علی احمد کو غالبًا مومن سے شرف تلمذ حاصل ہے، مگر تعجب ہے کہ اکثر تذکرہ نگاروں نے ان دونوں کا کوئی ذکر نہیں کیا — اسی سرزمینِ علم وفضل کی ایک نامور شخصیت مولانا عبد اللہ انصاری انبہٹوی ہیں، اور ان ہی کا تذکرہ یہاں مقصود ہے۔

مولانا انصاری صاحب کمال نامور فاضل، بلند نسبتوں کے جامع، متقی و پرہیز گار، اور ہر طبقہ خیال میں مقبول و معتمد شخص تھے۔ وہ دار العلوم دیو بند کے ابتدائی دور کے فارغ، مولانا مملوک العلی

نانوتوی کے نواسے، حضرت حاجی امداد اللہ کے مسترشد و خلیفۂ مجاز، حضرت مولانا محمد قاسم، اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے شاگرد، اور ہندوستان کے نامور اساتذۂ حدیث حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری، مولانا قاری عبد الرحمٰن پانی پتی، اور مولانا عالم علی مرادآبادی کے سلسلۂ تلمذ سے وابستہ، اور سندِ حدیث سے مفتخر تھے۔ ذاتی کمالات اور علم وصلاحیت کی وجہ سے ایم اے او کالج میں شعبۂ دینیات کے سربراہ مقرر ہوئے، تحریک ندوۃ العلماء کے رکن رکین قرار پائے۔ اور ریشمی رومال سازش کیس یا آزادی ہندوستان کی تحریک میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کے معاون و ہمنوا رہے۔

## خاندان و نسب:

مولانا عبد اللہ، انبہٹہ کے اس قدیم خاندان کے چشم و چراغ تھے جو حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی اولاد میں ہے، اور کئی سو سال سے انبہٹہ میں مقیم ہے۔ سلسلۂ نسب اس طرح ہے:

"عبد اللہ بن انصار علی بن احمد علی بن قطب علی بن شاہ غلام محمد بن شرف الدین خاں بن غلام محی الدین بن عبد الرشید بن فضیل محمد بن نظام بن قاضی امن بن خواجہ فرید الدین بن خواجہ محمد فاضل بن خواجہ ہاشم بن خواجہ علاء الدین بن خواجہ رکن الدین بن خواجہ نجم الدین بن خواجہ شرف الدین بن خواجہ تاج الدین بن خواجہ منہاج الدین بن خواجہ ہاشم بزرگ بن خواجہ ابی اسمٰعیل عبد اللہ الانصاری بن خواجہ ابی منصور محمد بن علی بن محمد بن احمد بن علی بن جعفر بن ابی منصور بن ابی ایوب خالد الخزرجی الانصاری صحابی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بن زید"[۵]

مولانا انصاری کا صحیح نسب نامہ اوپر گذر گیا ہے، اس سلسلہ کی ایک اور روایت مولانا محمد یعقوب نانوتوی سے منقول ہے کہ:

"میاں پیر جیو مولوی عبد اللہ صاحب...... یہ احقر کے ہمشیرزادہ ہیں، اور اولاد میں شاہ ابو المعالی انبہٹوی کے، بیٹے مولوی انصار علی صاحب کے"[۶]

مگر یہ اطلاع درست نہیں، کیونکہ حضرت شاہ ابو المعالی (متوفی سنہ ۱۱۱۶ھ) سادات حسینی میں ہیں، اور مولانا عبد اللہ کا حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ تک نسب نامہ آپ مولانا انصاری کے الفاظ میں ملاحظہ فرما چکے ہیں، اس لیے مولانا حضرت شاہ ابو المعالی کی اولاد قرار دینا کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے، شاہ ابو المعالی سے مولانا انصاری کے خاندان کا واحد رابطہ یہ ہے کہ مولانا کے جد امجد شاہ غلام محمد کا حضرت شاہ ابو المعالی کی پوتی سے نکاح ہوا تھا[۷]

مولانا عبد اللہ کے والد مولوی انصار علی آخری دور میں اپنے خاندان میں تعلیم یافتہ، پہلے شخص تھے[۸] مولانا انصار علی نے مولانا مملوک العلی سے تعلیم حاصل کی، اور ریاست گوالیار میں صدر الصدور مقرر ہوئے[۹] مفصل حالات اور تاریخ وفات دستیاب نہیں، مولانا مملوک العلی کی صاحبزادی مسماۃ نجیب النساء سے شادی ہوئی، تین بیٹے احمد حسین، عبد الرحمٰن اور مولانا عبد اللہ انصاری یادگار چھوڑے[۱۰]

## ولادت اور تعلیم:

مولانا عبد اللہ انصاری کی صحیح تاریخ ولادت معلوم نہیں، مگر مولانا کے ماموں مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۸۸ھ/ستمبر سنہ ۱۸۷۱ء میں مولانا عبد اللہ کی عمر بیس اکیس سال لکھی ہے، اگر یہ اندازہ صحیح ہے تو غالباً سنہ ۶۸-۱۲۶۷ھ میں مولانا کی ولادت ہوئی ہوگی۔

ابتدائی تعلیم وتربیت کی نسبت بھی معلومات مفقود ہیں۔ قرین قیاس ہے کہ والد ماجد، اور مولانا سخاوت علی صاحب انبہٹوی سے ابتدائی کتابیں پڑھی ہوں، بعد میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی سے تلمذ اور استفادہ ہوا، جو تعلیم کے انتہائی مرحلہ تک معاون و ہم قدم رہا، سنہ ۱۲۸۵ھ میں مدرسۂ عربی (دار العلوم) دیوبند میں داخلہ لیا، اور اعلیٰ درسی کتابوں کی تکمیل کی، اسی دوران حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی سے بھی تلمذ حاصل کیا، مولانا محمد یعقوب کا قول ہے:

"احقر سے اکثر کتابیں پڑھی ہیں اور جناب مولوی (محمد قاسم) صاحب سے پڑھا ہے"[۸]

مولانا انصاری نے دو سال دار العلوم میں گزارے، سنہ ۱۲۸۷ھ میں فارغ ہوئے، اور سنہ ۱۲۸۹ھ میں سند فضیلت سے نوازے گئے[۹]

اس وقت دارالعلوم کی فضاؤں میں محو پرواز طائر علم و کمال کا محور فکر و نظر حضرت شاہ عبدالغنی مجددی اور حضرت مولانا احمد علی محدث سہارن پوری کی ذات والاصفات تھیں، مگر جب مولانا انصاری دیوبند سے فارغ ہوئے تو حضرت شاہ عبدالغنی ہندوستان سے ہجرت کر چکے تھے، لیکن حضرت مولانا احمد علی کلکتہ میں قیام فرما تھے، اور درس و افادہ کا سلسلہ جاری تھا، مولانا انصاری مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے، حدیث پڑھی اور سند و اجازت حاصل کی[١٠] یہ تو معلوم نہیں کہ مولانا انصاری کی خدمت میں کب پہنچے، مگر قیاس چاہتا ہے کہ کلکتہ نہ گئے ہونگے بلکہ مولانا کے ایام تعطیل میں سہارنپور کے قیام کے دوران، یا کلکتہ کی ملازمت ترک کرنے کے بعد سہارنپور مستقل اقامت کے زمانہ میں اس کا موقع ملا ہو[١١] مولانا انصاری کو حضرت قاری عبدالرحمٰن پانی پتی، اور مولانا عالم علی مرادآبادی سے بھی قرات حدیث کا شرف اور سند و اجازت حاصل ہے[١٢]

## فیضان امداد کا عرفان:

مولانا انصاری بہت بچپن سے حضرت حاجی امداد اللہؒ سے واقف ہو گئے۔ مولانا کے اہل خاندان اور دارالعلوم کے اساتذہ حاجی صاحب کے دامن تربیت سے وابستہ، اور اُن کی عقیدت و محبت سے معمور تھے، گھر کی مجلسیں اور اساتذہ کے حلقے حضرت حاجی صاحب کے تذکروں سے گرم تھے، ان صحبتوں کے اثرات سے حاجی صاحب کی محبت و عظمت مولانا کے دل میں جاگزیں تھی، اور حب تعلیم کے (غالباً خاصے عرصہ کے) بعد درد محبت کی جستجو اور کسی اہل حق کی تلاش ہوئی تو نظر انتخاب حضرت حاجی صاحب پر گئی، مگر حضرت حاجی صاحب ہندوستان سے بہت دور مکہ معظمہ میں تھے۔ مولانا شوق طلب میں بے قرار ہو کر سفر پر نکل گئے، حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، مثنوی مولانا روم کا درس لیا، بیعت ہوئے اور اجازت و خلافت پائی۔ حاجی صاحب سے پہلی ملاقات کب ہوئی، کیا احوال و کیفیات پیش آئے، سلوک کی منزل میں کیا کیا واردات گزریں۔ اور کب اجازت سے مشرف ہوئے کچھ معلوم نہیں۔

مولانا کے سفر حجاز کی جو معلومات راقم سطور کی نظر میں ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کا پہلا سفر حجاز سنہ ۱۳۰۵ھ میں ہوا تھا، اور مولانا شوال سنہ ۱۳۰۵ھ/دسمبر ۱۸۸۷ء میں مکہ معظمہ حاضر تھے[١٣] اس سفر کی نسبت کوئی اطلاع دستیاب نہیں۔ دوسرا اہم اور طویل سفر غالباً سنہ ۱۳۰۷ھ میں ہوا، اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سفر حضرت حاجی صاحب کے ایما اور مشورہ کے خلاف ہوا، ممکن ہے حضرت نے سفر کی مشکلات یا معاشی وسائل کے فقدان یا کم یابی کی وجہ سے اس سے منع فرمایا ہو، لیکن مولانا پر یا تو شوق دید اور زیارت حرمین کا اشتیاق اس قدر غالب تھا کہ کوئی مانع اور رکاوٹ راستہ نہ روک سکی، اگر منع کرنے کی کوئی اور مصلحت تھی تو شاید مولانا کو حاجی صاحب کا پیام ایسے وقت ملا جب وہ سفر پر روانہ ہو رہے تھے، اس لیے مولانا نے اس مصلحت کا خیال نہیں کیا جس کی وجہ سے حضرت نے منع فرمایا تھا حضرت کی جانب سے سفر پر نہ آنے کی ہدایت کی اطلاع حضرت مولانا کے ایک خط سے ملتی ہے، حضرت تحریر کرتے ہیں:

> "مولوی عبداللہ کو منع کرنا حضرت سلمہ جو حافظ احمد صاحب کی تحریر سے دریافت ہوا تھا، اور خط بنام حافظ قمرالدین کے تھا، حافظ قمرالدین نے دکھایا، مگر نہیں مانا، معہ زوجہ و فرزندان ثلاثہ اور والدہ حافظ احمد، یعنی اپنی خوش دامن کو لیکر چلے گئے، آج بمبئی سے اُن کا خط بمبئی پہنچ جانے کا آیا، کہ ۱۹ر شعبان کو وہاں پہنچے۔"[١٤]

اس سفر میں حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں طویل قیام ہوا۔ مولانا قاری محمد طیب کی اطلاع ہے: "مکہ معظمہ میں حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کے پاس عرصہ تک قیام رہا۔"[١٥] اس کی کوئی اور تفصیل بمدست نہیں مگر اس میں شک نہیں کہ مولانا انصاری شوال سنہ ۱۳۰۸ھ/مئی ۱۸۹۱ء تک مکہ مکرمہ میں مقیم تھے۔ مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کی کتاب معائنہ جات میں مولانا کا معائنہ درج ہے جس پر سنہ ۱۳۰۸ھ کی تاریخ کتابت تحریر ہے۔[١٦]

مولانا انصاری کے ایک سفر حج کی کچھ اور اطلاعات بھی حضرت گنگوہی کے مکتوبات میں تحریر ہیں، مگر حضرت کے مکتوبات پر تاریخ کتابت تحریر نہیں اس لیے یہ فیصلہ آسان نہیں کہ یہ مذکورہ سفر حج سنہ ۱۳۰۷ھ

کے متعلق ہیں، یا کوئی اور بھی سفر ہوا تھا جس کا ہمیں علم نہیں۔

## اجازت وخلافت :

مولانا کو حضرت حاجی صاحب سے روحانی سلسلے میں اجازت و خلافت حاصل تھی (جو غالباً سنہ ۱۳۰۷ھ میں عطا ہوئی، اگرچہ اس حیثیت سے مولانا کا بہت زیادہ تعارف اور ارشاد و تلقین کی گرم بازاری نہیں تھی، تاہم کچھ لوگ مولانا سے بیعت تھے اور بیعت و اصلاح کا سلسلہ جاری تھا، مولانا کے معاصر، مولانا مشتاق احمد انبہٹوی لکھتے ہیں:

"عاجز کے مکرم مولانا عبد اللہ صاحب انصاری انبہٹوی اور مولانا کرامت اللہ خاں صاحب دہلوی بھی حضرت حاجی صاحب قبلہ کے مشہور خلفاء سے ہیں اور دونوں سے سلسلہ حاجی صاحب کا جاری ہے"[۱۷]

## تلاش معاش اور ملازمت :

مولانا، تعلیم کے بعد معاش کا کوئی ذریعہ نہ ہونے کی وجہ سے پریشان تھے، خود بھی مولانا نے تدبیر و جستجو کی ہوگی، اور مولانا یعقوب نانوتوی بھی اجمیر وغیرہ میں اپنے احباب سے مولانا کے لیے ملازمت کی تحریک و سفارش کر چکے تھے[۱۸] مگر کوئی صورت نہ بنی تھی خاصی پریشانی کے بعد سنہ ۱۲۸۸ھ/سنہ ۷۲-۱۸۷۱ء میں مدرسہ منبع العلوم گلاوٹھی (ضلع بلندشہر) میں پچیس روپے ماہانہ پر مدرس ہو گئے۔ سید محبوب رضوی نے لکھا ہے:

"سنہ ۱۲۸۷ھ میں جب گلاوٹھی میں منشی مہربان علی مرحوم نے مدرسہ منبع العلوم قائم کیا، تو (مولانا عبد اللہ انصاری) اس کے صدر مدرس بنائے گئے، بعد ازاں سنہ ۱۳۱۱ھ/سنہ ۱۸۹۳ء میں سرسید مرحوم نے ان کو علی گڑھ بلا کر اس وقت کے ام۔اے۔او کالج میں ناظم دینیات مقرر کیا۔"[۱۹]

مگر رضوی صاحب کی دونوں باتیں غلط ہیں، نہ تو مولانا کا سنہ ۱۲۸۷ھ میں گلاوٹھی میں تقرر ہوا، اور نہ وہ گلاوٹھی سے علی گڑھ گئے اگر مولانا انصاری سنہ ۱۲۸۷ھ میں منبع العلوم میں ملازم تھے، تو مولانا محمد یعقوب کو سنہ ۱۲۸۸ھ میں مولانا انصاری کے لیے تلاش ملازمت اور یہ لکھنے کی کیا ضرورت تھی:

"اگر ممکن ہو تو برخوردار مولوی عبد اللہ کے واسطے تم بھی سعی کیجیو، اس کا اب نکاح ہو گیا ہے، اور اس کو اب تلاش و طلب ہے۔"[۲۰]

اور مولانا محمد یعقوب کے ایک خط سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ مولانا عبد اللہ انصاری سنہ ۱۲۹۴ھ تک گلاوٹھی میں تھے[۲۱] جس سے ظاہر ہے کہ مولانا کا گلاوٹھی میں تقرر مولانا محمد یعقوب کے مذکورہ بالا خط مرقومہ سنہ ۱۲۸۸ھ کے بعد ہوا تھا۔

تقریباً سنہ ۱۳۰۱ھ میں گلاوٹھی کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر تھانہ بھون آئے، اور علی گڑھ روانگی کے وقت تک تھانہ بھون میں مقیم رہے، تھانہ بھون میں ملازمت کی اطلاع بھی مولانا محمد یعقوب کے مکتوبات میں تحریر ہے، حضرت حاجی امداد اللہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میاں عبد اللہ! ہمشیر زادۂ احقر گلاوٹھی سے آکر چندے بے کار رہ کر، اب کئی مہینہ سے تھانہ بھون میں مقرر ہوا، حافظ عبد الرزاق نے چندہ جمع کر کے اور آپ کفایت کر کر دوسرا مدرسہ قائم کیا ہے"[۲۲]

مولانا محمد یعقوب کے خط میں تاریخ کتابت تحریر نہیں، لیکن مولانا عبد اللہ گنگوہی کے درج ذیل الفاظ سے مدرسہ تھانہ بھون کی تعمیر و تاسیس تقریباً سنہ ۱۳۰۱ھ میں معلوم ہوتی ہے۔ لکھا ہے:

"اگرچہ مکان مدرسہ وقتاً فوقتاً بدلتا رہا، لیکن آخر کار اسی مسجد میں مدرسہ قائم ہوا، اور اس کی آبادی کی طرف مولوی عبد اللہ انصاری انبہٹوی نے توجہ کی، اور انہوں نے سنہ ۱۳۰۱ھ میں، یا اس کے پس و پیش میں دو بچدرے آگے پیچھے، اور اسی طرح جنوب کی جانب دو سہ دریاں تعمیر کرائیں۔"[۲۳]

اوپر گزر گیا ہے کہ مولانا اس وقت کے سنہ ۱۳۱۱ھ تک جب علی گڑھ میں تقرر ہوا تھانہ بھون مقیم رہے، مدرسہ کے انتظامی امور مولانا کے

سپرد تھے، بعض اسباق بھی پڑھاتے تھے، اور مثنوی مولانا روم کی تصحیح و تعلیق میں مشغول رہتے تھے، سرسید احمد کی اطلاع ہے کہ مولانا کو مثنوی کے کام کا کچھ معاوضہ بھی ملتا تھا۔[24]

مذہبی اور جدید تعلیم یافتہ دونوں طبقوں میں یہ خیال عام ہے کہ علماء انگریزی تعلیم کے مخالف تھے، اس کو جائز اور درست نہیں سمجھتے تھے، اور اسی وجہ سے وہ سرسید احمد اور ایم۔اے۔او کالج کے مخالف تھے، مگر یہ خیال صحیح نہیں، مولانا انصاری جو طبقۂ علماء کے ایک اہم نمائندے تھے۔ اُن کے علی گڑھ آنے، ایم۔اے۔او کالج کی ملازمت قبول کرنے کی تفصیلات ذکر کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ سرسید احمد اور اُن کی تعلیمی تحریک سے علماء کے اختلاف کی اصل وجہ پر کچھ روشنی ڈالی جائے، اور انگریزی تعلیم کے متعلق علماء کا موقف ذکر کر دیا جائے۔

**ام۔اے۔او کالج کا قیام اور اس کی مخالفت کے اسباب:**

مولانا انصاری گلاوٹھی میں تھے، کہ علی گڑھ ایم۔اے۔او کالج کا غلغلہ بلند ہوا، مگر عام مسلمان خصوصًا مذہبی طبقہ اس کی تائید اور حمایت میں بہت احتیاط کر رہا تھا، کیونکہ کالج کے بانی سرسید احمد خاں اپنے مذہبی افکار و خیالات کی وجہ سے بحث و تنقید کا موضوع بنے ہوئے تھے، سرسید احمد نے اپنے مقالات و مضامین میں جو تفسیر القرآن، تہذیب الاخلاق اور مختلف اخبارات و رسائل میں شایع ہو رہے تھے، اسلامی عقاید، اصول و قوانین اور تہذیب و معاشرت کے مختلف پہلوؤں کی تشریح و تنقید کا ایک سلسلہ شروع کیا ہوا تھا، جو قرآن و سنت کی صاف تعلیمات، اور مسلمانوں کے تیرہ سو سالہ روایات و معتقدات کے خلاف تھے۔ سرسید نے مذہب سے پوری واقفیت، متعلقہ مباحث پر گہری بصیرانہ نظر، اور ضروری علمی صلاحیت کے بغیر یہ کام شروع کیا تھا، ظاہر ہے کہ وہ علماء جن کی پوری زندگی دین و شریعت پر غور و فکر، اس کی خدمت اور پڑھنے پڑھانے میں گزری وہ شریعت کے ساتھ اس مذاق اور تحریف کو کس طرح گوارا کر سکتے تھے چنانچہ علماء نے سرسید کی تحریرات پر سخت ردعمل ظاہر کیا، مضامین و مقالات لکھے، اور سرسید کی علمی فکری کمزوری کو بے نقاب کیا، بعض مسائل میں سرسید کی نارسائی فکر کے متعدد شواہد، اور علم و استدلال میں کمزوری کی صاف نشان دہی کے باوجود سرسید نے مذہبی مسائل پر اپنے کسی قول سے رجوع نہیں کیا، بلکہ سرسید احمد کی "مجتہدانہ نگارشات" کے خلاف ردعمل جس قدر شدید ہوتا گیا، سرسید کا اپنی رائے پر اصرار، اور مذہبی موضوعات پر لب و لہجہ تیز ہوتا گیا۔ حالانکہ بعض موضوعات پر سرسید کی صریح فروگذاشتوں کے اعلان و اعتراف میں سرسید کے نامور رفقاء نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، صفدر یار جنگ، نواب حبیب الرحمن خاں، اور علامہ شبلی نعمانی بھی علماء کے ہم نوا تھے، اور ان سب نے اپنے مختلف مضامین میں سرسید کی غلطیوں پر گرفت کی، اور ان مسائل کے سلسلے میں امت کے معروف مسلک کا دفاع کیا، لیکن سرسید کی مخالفت کے جرم میں صرف علماء بدنام ہیں ــــ کیوں؟؟

کالج کے ابتدائی زمانہ میں یہ بات قرین قیاس تھی کہ سرسید کالج کے ذریعے اپنی مذہبی تحقیقات کی تبلیغ و تلقین کرنا چاہتے ہیں، اور وہ کالج کے طلبہ کو اسی رنگ میں رنگنا، اور اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کریں گے۔ ایسے میں علماء سے یہ توقع صحیح نہیں تھی کہ وہ سرسید کی حمایت کریں، اور نئی نسلوں کے ایمان و یقین کا خطرہ مول لے کر اُن کو علی گڑھ جانے اور ایم۔اے۔او کالج میں پڑھنے کا مشورہ دیں۔ یہاں ڈاکٹر اشتیاق احمد قریشی کے یہ الفاظ یاد آتے ہیں:

> "اگر ان حالات میں مسلمانوں نے جنہیں اس تعلیم کی حقیقی نوعیت کا علم نہیں تھا، اسے اپنے مذہب سے ورغلانے کی محض ایک تدبیر سمجھا تو وہ قابلِ معافی تھے۔"[25]

سرسید سے علماء کے اختلاف (مخالفت نہیں) اور مدرسۃ العلوم میں تعلیم سے ممانعت کی بنیادی وجہ کو نظر انداز کر کے ایک طبقہ کی طرف سے بار بار یہ اعتراض دہرایا جاتا ہے کہ علماء انگریزی تعلیم کے مخالف تھے۔ حالانکہ یہ بات تحقیق کے خلاف اور سچائی سے دور ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اہل نظر محتاط علماء نے انگریزی زبان و تعلیم کی، غیر ملکی یا عیسائیوں کی زبان ہونے کی وجہ سے کبھی بھی مخالفت نہیں کی، وہ نہ انگریزی پڑھنے پڑھانے کو حرام، مکروہ یا بُرا جانتے تھے، اور نہ مغربی طرز تعلیم اور جدید نئی تحقیقات و مطالعات کی ضرورت اور افادیت کے منکر تھے، علماء کی تو صرف یہ گزارش اور درخواست تھی کہ:

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اڑو، چرخ پہ جھولو
بس ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

ہندوستانی علماء کے سرخیل و پیشوا حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے انگریزی پڑھنے کی اس وقت اجازت دے دی تھی[۲۶] جب معاشرہ اور نظام حکومت میں انگریزی کا خاص عمل دخل نہیں تھا، اور میکالے کے بقول انگریزی کی تعلیم کا مقصد صرف یہ تھا کہ:

"لوگوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا کیا جائے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو، مگر مذاق، رائے اور ذہن کے اعتبار سے انگریز ہو"

میکالے اپنے مقاصد میں کامیاب ہوا، ہنٹر کی شہادت ہے کہ:

"ہمارے اینگلو انڈین سکولوں سے کوئی نوجوان خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، ایسا نہیں نکلتا جو اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کے انکار کرنا جانتا ہو"[۲۷]

انگریزی کی تعلیم، اور اسکولوں کے متعلق انگریز حکام کے ایسے صاف بیانات کے بعد بھی علماء نے انگریزی تعلیم کے متعلق اپنے فتاوی پر نظر ثانی نہیں کی، اس کے بعد بھی انگریزی پڑھنے کی برابر اجازت دیتے رہے، اور خود علماء کو بھی انگریزی پڑھنے اور نئی تحقیقات، اور مغربی علوم سے استفادہ میں کوئی عار نہیں ہوا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے ایک نامور شاگرد مولانا مملوک العلی نانوتوی نے تحریر اقلیدس کا اردو ترجمہ کیا، گارسان دتاسی کا خیال ہے کہ یہ ترجمہ فارسی سے ہوا،[۲۸] مگر راقم سطور کا خیال ہے کہ یہ ناممکن نہیں کہ یہ ترجمہ براہ راست انگریزی متن سے کیا گیا ہو، مغربی علوم پر ایک رسالہ ہندوستان کے نامور عالم قاضی محمد اعلیٰ تھانوی مولف "کشاف اصطلاحات الفنون" کی یادگار بتایا جاتا ہے[۲۹] لیکن اس اطلاع کی صحت مشتبہ ہے۔ ہندوستان کے بڑے ممتاز عالم مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اپنے آخری سفر حج سنہ ۱۲۹۵ھ کے بعد تبلیغ اسلام کے لیے انگریزی پڑھنے کا ارادہ فرمایا تھا، مگر مولانا کی عمر نے وفا نہیں کی، جلد ہی وفات ہوگئی تھی اس لیے یہ ارادہ روبعمل نہ ہوسکا[۳۰] لیکن مولانا کے ہم عصر اور متاخر عہد کے متعدد علماء، مثلاً مولانا محمد احسن نانوتوی،[۳۱] مولوی منشی جعفر تھانیسری[۳۲] مولانا خلیل احمد انبہٹوی[۳۳] وغیرہ انگریزی سے واقف تھے، اول الذکر دونوں صاحبان انگریزی لکھنے پڑھنے کی اچھی صلاحیت رکھتے تھے، اور اس سے کام لینے میں کوئی جرم نہیں سمجھتے تھے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز کے فتوے کے بعد بھی متعدد علماء سے انگریزی کی تعلیم و تدریس کے متعلق سوالات کیے گئے، سب نے اس کے جائز ہونے کا فتویٰ دیا، حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہی نے لکھا:

"انگریزی زبان سیکھنا درست ہے، بشرطیکہ کوئی معصیت کا مرتکب نہ ہو، اور نقصان دین میں اس سے نہ آوے"[۳۴]

فخر المتاخرین حضرت مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کا قول ہے:

"انگریزی پڑھنا اور زبان سیکھنا جائز ہے بشرطیکہ منجر تخلل دینی کی طرف نہ ہو"[۳۵]

یہ دونوں بزرگ، فقہ و فتاویٰ کے مرجع، اور تمام علماء کے پیشوا، اور مقتدا تھے، ان کی طرف سے جواز کے فتوے کے بعد کون اختلاف کی جرأت کرسکتا تھا، اور جن اصحاب نے اختلاف کیا ہے ان کو علم و کمال میں اوّل الذکر بزرگوں سے کوئی مناسبت نہیں، اس لیے اس کا ذکر غیر ضروری ہے۔

حضرت گنگوہی انگریزی کی ضرورت و اہمیت سے آشنا تھے، اور اس کے متعلق بہت کشادہ ذہن رکھتے تھے، یہاں تک کہ

عربی مدارس میں بھی انگریزی پڑھانے کو روایات و اصول کے خلاف اور ناپسندیدہ خیال نہیں فرماتے تھے۔ حضرت گنگوہی کا ارشاد تھا کہ: (مدرسوں کے نصاب تعلیم میں شامل) منطق اور فلسفہ سے تو انگریزی بہتر (ہے) کہ اس سے دنیا کے نفع کی امید تو ہے[۳۶] غالباً یہ حضرت گنگوہی کے خیالات اور فیض صحبت کا اثر تھا کہ (ایک روایت کے مطابق) مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی نے آخر عمر میں انگریزی پڑھی اور اس میں اچھی صلاحیت اور استعداد بہم پہنچائی[۳۷] بہت سے قارئین کو تعجب ہوگا کہ انگریزی پڑھنے پڑھانے کے متعلق اس قدر وسعت اور رواداری برتنے والے علماء سرسید احمد اور ایم۔اے۔او۔ کالج کے بارے میں کشادہ قلبی سے کام نہ لے سکے۔ اس کی وجہ جاننے کے لیے سرکاری اسکولوں کالجوں اور ایم۔اے۔او۔ کالج کے درمیان ایک اہم بنیادی فرق اور نکتۂ اتحاد یاد رہنا چاہیئے۔

مغلوں کے آخری زمانہ میں اور سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں انگریزی کی تعلیم کے ادارے دو قسم کے تھے، صرف انگریزی، مغربی تعلیم کے، اور مشرقی مغربی دونوں علوم کے مشترک، انتظامیہ دونوں کا غیر ملکی مسیحی، اور مشترک تعلیم کے مراکز میں اکثر تدریسی عملہ ہندوستانیوں پر مشتمل ہوتا تھا، موخر الذکر اداروں میں تبلیغ عیسائیت کا مشن خاصا کمزور تھا، پہلی قسم کے ادارے اور مشنری اسکول تبلیغ مسیحیت کی خدمات میں سرگرم رہے، لیکن ان اسکولوں کالجوں سے مسلمانوں کا رابطہ بہت کم اور معمولی سا رہا۔ مسلمان علماء اور عوام صاف کہتے تھے:

جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں؛

## ایم اے او کالج سے ایک مذہبی خطرہ:

بدقسمتی کہ مذہبی موضوعات پر سرسید کی متنازعہ تحریرات نے ایم اے او کالج علی گڑھ کو بھی اسی فہرست میں شامل کرادیا تھا، اسی لیے علماء نے ایم۔اے۔او۔ کالج کے ساتھ کشادہ قلبی اور رواداری میں احتیاط کی، کیونکہ مشنری اسکولوں اور سرکاری کالجوں کے متعلق عام مسلمان بھی جانتے تھے کہ یہ عیسائیوں کے زیر انتظام ہیں۔ اور وہ ان کو اپنے خاص مقاصد اور مذہب کی تبلیغ کے لیے چلا رہے ہیں ان اداروں میں جو مسلمان تعلیم پاتے تھے، ان کے سرپرست اور وہ طلبہ خود بھی مشنری کے جال، اور عیسائیت کے اثرات سے چوکنا اور باخبر رہتے تھے، اور اپنے اور عیسائیوں کے درمیان اختلاف مذہب، اور ایمان و عقیدے کے نازک فاصلے کو بہت احتیاط سے برقرار رکھتے تھے، لیکن ایم۔اے۔او۔ کالج میں یہ احتیاط ممکن نہیں تھی، کیونکہ سرسید احمد خاں ایک نامور مسلمان، اور ممتاز علماء کے شاگرد اور فیض یافتہ تھے، ان کی اس شہرت و تعارف کی وجہ سے نوعمر طلبہ کا سرسید کے افکار و نظریات اور امت مسلمہ کے عقاید و خیالات میں امتیاز کرنا بہت دشوار تھا، وہ سرسید احمد کے مضامین و تحریرات سے مذہب اور عقیدے کو پہنچنے والے نقصانات کا اندازہ نہیں کرسکتے تھے، اس لیے تمام علماء نے یک زبان ہوکر ایم۔اے۔او۔ کالج کی مخالفت کی، اور مسلمانوں کو اس سے دور رکھنے میں کامیاب رہے۔

## حقیقت کی وضاحت اور سرسید کی علماء سے تعاون کی درخواست:

جب سرسید احمد کو یقین ہوگیا کہ کالج کی مخالفت کی وجہ علماء کی انگریزی سے ناواقفیت، یا اس کے پڑھنے پڑھانے کی مخالفت نہیں بلکہ مذہبی موضوعات پر میرے افکار اور نئی تحقیقات کے خلاف احتجاج ہے تو سرسید احمد نے اپنے ذاتی مسائل، مذہبی عقاید و تحقیقات اور کالج کی تعلیم و ترقی کے معاملات کو الگ الگ رکھنے کی اپیل کی، اور مختلف تحریرات، خطوط اور بیانات کے ذریعے اس خیال کا اعادہ کرتے رہے، ایک خط میں تحریر ہے:

"(میں نے) مدرسۃ العلوم کی بنا اس لیے ڈالی ہے کہ مسلمان علوم دینی اور دنیاوی اور علوم جدیدہ غربیہ سے، اور مختلف زبانوں اور نئے نئے فنون اور ہنروں سے جو اس زمانہ میں بکار آمد ہوں، واقف ہوں۔ علوم دینی کی نسبت مجھے کچھ پرواہ نہیں ہے کہ حنفی اصول پر پڑھایا جائے یا شافعی اصول پر، یا مالکی اور حنبلی اصول پر، یا اخباری اور اصولی اصول پر، یا معتزلی و

ناصبی اصول پر، یہ وہ لوگ جانیں جن کے ہاتھ میں ان علوم کی تعلیم کا انتظام ہوگا۔ نہ میں اس انتظام کے لائق ہوں اور نہ کبھی اس کے انتظام سے مجھے تعلق ہوگا، میری غرض صرف علوم و فنون سے ہے کہ جس طرح ہوسکے مسلمانوں میں لائے جائیں، خواہ وہ کوٹ پہن کر پڑھیں خواہ عبا و عمامہ باندھ کر، پس جو اصرار کا اتہام میری نسبت کیا گیا محض غلط ہے۔"[۳۸]

ایک اور موقع پر لکھا ہے:

"مدرسۃ العلوم قومی مدرسہ ہوگا جس میں عموماً ہر فرقے کے لوگ تعلیم پاویں گے، اگر میرے ذاتی خیالات پر بحث کی جاوے گی تو ایک دن بھی کام نہ چل سکے گا۔ پہلے بسم اللہ شیعہ فرمادیں گے کہ اس کا بانی ایک سنّی، کافر، ناصبی دشمن اہل بیت ہے (نعوذ باللہ منہا) اس سے ڈرو، اور کبھی (اس کے کام میں) شریک مت ہو، پس جس طرح کہ شیعہ مجھ کو راہ حق پر یقینی نہیں سمجھتے، سنّی بھی نہ سمجھیں اور میرے ذاتی عقاید اور مذہب اور خیالات اور رائے سے بحث نہ کریں، بلکہ جو قومی معاملات ہیں ان پر قومی معاملات کی طرح بحث کریں، وہ دیکھیں کہ کمیٹی میں جو لوگ ممبر ہیں ان میں شیعہ اور وہابی اور بدعتی اور بے دینیے سب داخل ہیں یا نہیں۔ وہ دیکھیں کہ دنیاوی علوم کی تعلیم جو تمام قوم کے لیے تجویز کی گئی ہے اور جس کے بغیر دنیاوی عزت اور قومی ترقی غیر ممکن ہے وہ تمام قوم کے لیے مناسب ہے یا نہیں۔ شیعوں کو یہ دیکھنا چاہیے کہ جو مذہبی تعلیم ان کے لیے تجویز ہوئی ہے وہ ان کے مذہب کے مطابق ہے یا نہیں، سنّیوں کو یہ دیکھنا چاہیے کہ جو مذہبی تعلیم ان کے لیے تجویز ہوئی ہے وہ ان کے مذہب کے مطابق ہے یا نہیں، سید احمد کے مذہب اور اس کے عقاید اور خیالات سے ان کو کیا مطلب ہے، ورنہ مجھ کو تو جو قومی بھلائی کے لیے کوشش کرنے کا دعویٰ کرتا ہوں بڑی مشکل پڑے گی۔"[۳۹]

کالج کے تعلیمی نظام، اور اپنے مذہبی عقاید و خیالات کو الگ الگ رکھنے کی تصریحات و اعلانات کے ساتھ سرسید نے کالج میں مذہبی تعلیم کے لیے علمار کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی، ممتاز علمار کو خطوط لکھے خصوصاً حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی سے درخواست کی کہ ان تینوں میں سے کوئی ایک، یا ان کا کوئی معتمد نمائندہ علی گڑھ کالج میں شعبۂ دینیات کی سرپرستی قبول کرلے، وہ کالج میں مذہبی فرائض و مراسم کی بجا آوری کا ذمّہ دار ہو، اور عصری تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے طلبہ کو دینیات اور شریعت و اخلاص کا درس دے، اور ان کی اصلاح و تربیت کرے، مگر اس خدمت کو قبول کرنے سے تینوں صاحبان نے معذرت فرمادی، حضرت مولانا محمد قاسم نے فرمایا کہ:

> "سید صاحب کی ہاں میں ہاں ملانا ہم سے جبھی متصور ہے کہ سید صاحب اپنے ان اقوال مشہورہ سے رجوع کریں جو ان کی نسبت ہر کوئی گاتا پھرتا ہے، اور سید صاحب ان پر اصرار کیے جاتے ہیں اور رجوع نہیں فرماتے ہو۔"[۴۰]

## مولانا انصاری کا علی گڑھ میں تقرر:

علمار کا تعاون حاصل کرنے میں ناکام رہنے کے بعد سرسید کئی سال تک اپنے مذہبی افکار و خیالات اور ایم اے. او کالج کے تعلیمی مقاصد کو الگ الگ رکھنے کی جدوجہد میں مصروف رہے، شعبۂ دینیات کی سربراہی کے لیے کوئی کوشش نہیں کی، عرصہ کے بعد جب سرسید کو اندازہ ہوگیا کہ اہل بصیرت علمار کالج اور میرے مذہبی افکار کو الگ الگ سمجھنے لگے ہیں، اور غالباً ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ کالج کا کیا مقصد ہے اور وہ کس طرح کی خدمت کر رہا ہے تو شعبۂ دینیات کے لیے کسی عالم کو علی گڑھ بلانے کی ایک اور تحریک کی، اس کے لیے سرسید نے بہت غور و فکر کیا ہوگا، ہندوستان کے اکثر علمار پر نظر ڈالی ہوگی، اپنے نقطۂ نظر سے خوب جانچا پرکھا ہوگا، خاصے غور و فکر کے بعد نگہ انتخاب مولانا انصاری

پر گئی، اور سرسید احمد خاں کے الفاظ میں:

"وہ (مولانا انصاری) صدہا علماء میں سے اس جلیل القدر کام کے واسطے منتخب کیے گئے ہیں۔"[۴۱]

مولانا انصاری سے سرسید کا رابطہ مولوی منشی محمد سعید تھانوی ناظم شعبۂ تبلیغ ایم۔اے۔او کالج کے ذریعے قائم ہوا، اور غالباً سنہ ۱۸۹۳ء میں مولانا سے خط و کتابت شروع ہوئی، اس مراسلت کی تمام تفصیلات میری دسترس میں نہیں ہیں، لیکن اس میں زیادہ وقت خرچ نہیں ہوا، دونوں طرف سے تین چار خطوط کا تبادلہ ہوا، اور شرائط ملازمت طے ہوگئے، اس سلسلۂ مراسلت کا ایک اہم خط جس میں سرسید نے مولانا کو فرائض و خدمات کی تفصیل، تنخواہ کی مقدار، اور اس میں متوقع اضافہ کی رفتار سے آگاہ کیا ہے دستیاب ہے، اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں پچاس روپے مہینہ مقرر ہوا، اور کالج کی طرف سے کھانے کے انتظام کی پیش کش ہوئی، اگر مولانا کالج سے کھانا لینا پسند نہ کریں تو تنخواہ میں دس روپے مہینہ کا اضافہ ہو کر ساٹھ روپے ملتے، مگر سرسید احمد اس قلیل رقم سے مطمئن نہیں تھے، انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ یہ رقم آہستہ آہستہ بڑھا کر سو روپے ماہانہ کر دی جائے گی، سرسید نے اپنے اس قول کی پوری پاسداری کی، ملازمت شروع ہونے کے چار سال بعد سنہ ۱۸۹۷ء میں مولانا کی تنخواہ اسی روپے ماہانہ ہوگئی تھی، بعد میں اور اضافہ ہو کر سو روپے ماہوار ہوگئی ہوگی۔ سرسید کے اس اہم خط کا متعلقہ اقتباس درج ذیل ہے:

"مگر ہم کو افسوس ہے کہ بالفعل بہ لحاظ حالات مدرسہ ہم اُن کو اس قدر معاوضہ نہیں دے سکتے۔ جس قدر کہ دینا چاہیے، مگر مکان کی درستی فرش وغیرہ اور مکان کی روشنی وغیرہ ہم سب مہیا کریں گے، اگر وہ یہ چاہیں کہ اُن کے کھانے کا انتظام بھی خود مولوی صاحب اپنے آپ کرنا چاہیں تو ساٹھ روپے ماہواری اُن کو دیں گے، اور اگر ہم دیکھیں گے کہ اس انتظام سے ہمارا مقصد بخوبی حاصل ہوتا ہے تو ہم رفتہ رفتہ ان کی تنخواہ سو روپے تک بڑھا دیں گے، مجھ کو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مولوی صاحب نے تصحیح اور تحشی مثنوی مولانا روم کا کام اپنے ذمے لیا ہے اور اس کا معاوضہ بھی کچھ ان کو ملتا ہے، اس سے ہم کو کوئی مزاحمت نہیں ہے۔"[۴۲]

## ایم اے او کالج میں مولانا انصاری کا قیام اور اس کے اثرات و ثمرات:

شرائط ملازمت طے ہونے کے بعد مولانا فوراً ہی علی گڑھ آ گئے تھے، مولانا عبدالحی حسنی رائے بریلوی نے (جو مولانا انصاری سے بہت قریب سے واقف تھے) مولانا کا علی گڑھ میں ورود سنہ ۱۳۱۱ھ میں بیان کیا ہے[۴۳] میرا خیال ہے کہ یہ شاید اوائل محرم سنہ ۱۳۱۱ھ/جولائی ۱۸۹۳ء ہو۔ سرسید نے مولانا کی شایانِ شان پذیرائی کی اور محبت و احترام سے نوازا، اور مولانا انصاری نے بھی متعلقہ فرائض و خدمات بہت خوش اسلوبی سے انجام دیے، مولانا کے فیضِ صحبت سے کالج کے طلبہ میں مذہبی جذبات کی لہر دوڑ گئی۔ اسلامی عقاید و مسائل سے واقفیت اور دینی معلومات کا شوق بڑھا، تلاوتِ قرآن کے معمول اور پنجگانہ نمازوں کی حاضری میں نمایاں اضافہ ہوا، مولانا کے طریقۂ اصلاح و تکلم اور شفقت و محبت کے جذبات نے تمام طلبہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ طلبہ مولانا کی کلاس سے بہت کم غیر حاضر رہتے، اور ایسے طلبہ بھی جو مولانا کے شاگرد، اور سنی نظام دینیات سے وابستہ نہیں تھے اور اپنی مذہبی کلاسوں سے اکثر غیر حاضر رہتے تھے مولانا کے حلقۂ درس میں بہت اہتمام اور پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ سر رضا علی لکھتے ہیں:

"سنی شیعہ سب اُن کے درس میں شریک ہوتے تھے۔"[۴۴]

اور یہ سب مولانا کی محنت اور صلاحیت اور کمال تربیت کا اثر تھا ورنہ اس زمانہ میں نصاب دینیات بہت ناقص اور غیر مفید تھا، نواب وقار الملک کا قول ہے:

"میں مقر ہوں کہ نصاب تعلیم دینیات کالج کافی نہیں، اور بہت کچھ ناکافی ہے۔"[۴۵]

## شعبۂ دینیات کے امتحان کے لیے مشہور علماء کا انتخاب:

مولانا کے عہد نظامت میں دینیات کے طلبہ اپنے

مضمون میں ایسے باصلاحیت اور ماہر ہوتے تھے کہ اکثر امتحانات میں اعزاز کے ساتھ کامیاب ہوتے تھے، اور یہ طلبہ کی صلاحیت پر اطمینان اور اپنی محنت و کوشش پر اعتماد کی علامت تھی کہ مولانا شعبۂ دینیات کے امتحان کے لیے ہمیشہ نامور علماء کو طلب کرتے تھے، سنہ ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مولانا احمد علی مدرس سراوہ وغیرہ متعدد علماء سے درخواست کی گئی کہ وہ تشریف لاکر شعبۂ دینیات کا امتحان لیں، اس موقع پر مولانا انصاری نے حضرت تھانوی کو لکھا تھا:

"سراپا مجد و کرم، مولانا الحاج الحافظ مولوی اشرف علی صاحب تھانوی، بعد سلام مسنون الاسلام!
عرض ہے کہ اس سال دینیات کے امتحان کے لیے کمیٹی دینیات کالج علی گڑھ کے ممبروں نے آپ کو اور مولوی احمد علی صاحب مدرس میرٹھ۔ و مولوی حفیظ اللہ صاحب۔ و مولوی عبدالغنی صاحب شاگرد رشید مولانا محمد لطف اللہ صاحب کو تجویز کیا ہے، شاید آخر فروری یا مارچ میں امتحان ہوگا، تین سو پرچے جانچنے اور ان پر نمبر لگانے ہوں گے، سب سے پہلے آٹھ کتابوں کے سوالات بنانے ہوں گے غرض ایک ہفتہ کا کام یہاں ہوتا ہے، امید کہ اگر آپ قبول فرمائیں تو میں آپ کو تقرر تاریخ امتحان سے مطلع کر دوں، اس سے دو روز قبل آپ یہاں رونق افروز ہوں تاکہ سوالات تجویز فرمائیں، سوالات طبع ہوں گے۔ فقط والسلام۔" [۲۶]

مولانا تھانوی نے امتحان میں آنے سے معذرت کر دی تھی، امتحان کن لوگوں نے لیا، کیا نتیجہ رہا کچھ معلوم نہیں، لیکن اس واقعہ کے تقریباً ایک سال بعد، مولانا کی صلاحیت اور شعبۂ دینیات کی کارکردگی کا ایک بڑا امتحان ہوا، جس کے شاندار نتائج نکلے، اور مولانا کی عزت و ناموری کا باعث ہوئے، اس وقت کالج کے مخالفین اور شاید اکثر ہمدردوں کو بھی پہلی بار اس حقیقت کا علم ہوا کہ کالج میں دینیات کی تعلیم کا ایسا اچھا، قابل تعریف انتظام ہے۔

**شعبۂ دینیات کی کارکردگی کا ایک اعلیٰ امتحان:**

اس کی تقریب یہ ہوئی کہ امیر حبیب اللہ خاں والی افغانستان ٹرسٹیان کالج کی دعوت پر اپنے دورۂ ہندوستان کے وقت جنوری سنہ ۱۹۰۷ء/ذی الحجہ سنہ ۱۳۲۴ھ میں علی گڑھ نزول فرما ہوئے، اور گہری ناقدانہ نظر سے مدرستہ العلوم کا تفصیل سے معائنہ کیا، اس معائنہ کا سب سے نازک اور مشکل مرحلہ مولانا انصاری کے شاگردوں اور شعبۂ دینیات کا امتحان تھا، اور اسی میں سب سے زیادہ کامیابی ملی۔ مولوی محمد امین زبیری نے اس موقع کی دلچسپ روداد قلم بند کی ہے جو اگرچہ طویل ہے مگر تمام پڑھنے کے لائق ہے۔

علی گڑھ پہنچ کر امیر حبیب اللہ خاں نے محسن الملک سے صاف کہہ دیا تھا کہ:

"میں دو حیثیت سے کالج دیکھ سکتا ہوں، ایک بطور ممتحن کے، دوسرے بطور سیاح کے، پہلی حیثیت سے ضرور ہے کہ ہر بات کی تحقیق و تفتیش اور طلبہ کا امتحان کر کے میں اپنی رائے ظاہر کروں، دوسری صورت میں معمولی اور رسمی طور پر کالج کو دیکھ کر رخصت ہو جاؤں۔ اب بتاؤ! ان دونوں باتوں میں سے کس کو ترجیح دیتے ہو، میری اچھی یا بری رائے امتحان لینے پر منحصر ہوگی۔" [۲۷]

محسن الملک نے امتحان کے مشکل لیکن غیرت مندانہ اور باعزت طریقے کو ترجیح دی، تو امیر حبیب اللہ نے بنفس نفیس ایک ایک چیز کا جائزہ لیا، دارالاقامۃ کا معائنہ کیا، نماز کے کمرے دیکھے اور پھر طلبائے دینیات سے ملنے اور ان کا امتحان لینے کا خیال ظاہر کیا، تعمیل ارشاد میں شیعہ دینیات کے کچھ طلبہ پیش کیے گئے، ان سے معمولی سوال و جواب ہوئے، بعد میں مولانا انصاری سنی دینیات کے پچاس سے زائد طلبہ کو لے کر آئے، جو اسکول اور کالج کی مختلف کلاسوں کے تھے۔ معزز مہمان نے چند طلبہ کا خود انتخاب کیا، اور ان سے

سوالات شروع کیے، طلبہ نے اکثر سوالات کے صحیح جوابات دیے، آخر میں ایک طالب علم سے تلاوتِ قرآن کی فرمائش کی، طالب علم کی دلکش آواز اور آیات کے حسنِ انتخاب نے سماں باندھ دیا، امیر حبیب اللہ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ تلاوت ختم ہوئی تو امتحان پورا ہوچکا تھا، ممتحن بہت مسرور اور مطمئن ہوئے، اور کہا: "اس (کالج) کی جو بدگوئی مجھ سے کی گئی ہے سب غلط اور جھوٹ"! امیر، طلبہ کی دینی صلاحیت اور معلومات سے نہایت خوش تھے، اپنی مسرت و خوشنودی کا بار بار اظہار کیا، جب محسن الملک نے امیر کو کالج کی طرف سے سپاس نامہ پیش کیا تو امیر نے اس کو صرف وہاں تک سنا جہاں دینی تعلیم کا تذکرہ شروع ہوتا تھا، باقی حصہ کو چھوڑ دیا اور فرمایا: "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" شاہ نے جوابی تقریر میں کالج میں دینی تعلیم پر اطمینان ظاہر کیا، اور کالج کے لیے شاہانہ عطیہ کی سند میں بھی اس اعتماد کا تذکرہ ہے، امیر نے لکھا ہے کہ:

"اگرچہ از زبان بعضے مردم در باب شاگردان کالج موصوف شنیدہ بودم کہ در عقاید اسلامیہ خود درست نمی باشند، اما خود من بحضور خود بزبان خود از شاگردان کالج موصوف امتحان بعضے عقاید ضروری اسلام و مسائل نماز و روزہ گرفتم، تمام سوالہائے مرا بطریق عقاید اہل اسلام جواب گفتند۔ بعد ازاں کہ اطفال اہل اسلام بعقاید ضروری فرائض اسلام دانستہ شوند ہرگاہ شروع درس مروجہ یورپ را بکنند ہیچ عیبے نیست" ۴۹

ترجمہ:

"اگرچہ میں نے بعض لوگوں سے اس کالج کے طلبہ کے متعلق سنا تھا کہ وہ اپنے اسلامی عقیدے میں صحیح نہیں ہوتے، مگر خود میں نے اپنے سامنے اپنی زبان سے اس کالج کے کچھ طلبہ کا، اسلام کے ضروری عقاید و مسائل، اور نماز و روزہ کے متعلق (معلومات کا) امتحان لیا۔ طلبہ نے میرے تمام سوالات کا عقاید اسلام کی رو سے صحیح جواب دیا۔ جب مسلمانوں کے بچے اسلام کے ضروری عقاید اور فرائض اسلامی سے واقف ہوں تو وہ چاہے جہاں مغربی طریقے پر تعلیم حاصل کریں کوئی حرج نہیں ہے":

مولانا کے شاگردوں کی ایسی غیر متوقع شاندار کامیابی سے کالج کو غیر معمولی فائدہ حاصل ہوا، کالج کے خالص تعلیمی مقاصد کی شہرت اور مدرسۃ العلوم کے طلبہ کی لامذہبیت اور نیچریت کی تردید میں درجنوں تقریریں اور مقالات وہ کام نہ کرسکے تھے جو شاہ افغانستان کے چند کلمات سے ہوا، امیر حبیب اللہ کی پرجوش تحسین و تائید کی گونج پورے ملک میں بہت دور تک سنی گئی اور کالج کے متعلق غلط فہمیوں، اور طلبہ کی نیچریت کے اعتراضات کو اپنے ساتھ بہا کرلے گئی۔

## مولانا کی قدر و منزلت سرسید کی نظر میں:

مولانا کے علی گڑھ میں تقرر کے وقت جو فرائض مولانا کے سپرد ہوئے تھے، سرسید کی حیات تک وہ جوں کے توں رہے، اس میں کوئی اضافہ اور کمی نہیں ہوئی۔ مولانا شبلی نعمانی نے جو اس وقت طلبہ کو قرآن شریف کا ترجمہ پڑھایا کرتے تھے ایک مرتبہ خواہش کی کہ یہ درس مولانا انصاری کے سپرد کردیا جائے، لیکن سرسید نے اس کو منظور نہیں کیا، اور علامہ کی درخواست پر ناگواری ظاہر کی۔ سرسید کے خط سے اندازہ ہو رہا ہے کہ ان کی نظر میں مولانا کا کس قدر احترام، اور قدر و منزلت تھی اور وہ مولانا کے متعلق کیا تاثرات رکھتے تھے اور اُن کے کام سے کس قدر مطمئن تھے۔ علامہ شبلی کا خط اور سرسید کا جواب دونوں سطور ذیل میں ملاحظہ ہوں۔ علامہ شبلی نے لکھا ہے:

"قبلہ ام! آداب        مولانا انصاری ماشاء اللہ جلیل القدر فاضل اور نہایت بابرکت شخص ہیں، اب یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف کا ترجمہ جو کہ خاکسار کالج کلاس کے طلبہ کو پڑھاتا ہے وہ مولانا صاحب ممدوح کے متعلق کردیا جائے۔ علاوہ عمدہ

تعلیم پانے کے طلبہ کو ان کی برکت سے روزانہ مستفید ہونے
کا موقع ملے گا۔" ۵۰؎

سید نے جواب میں تحریر کیا:
"مولوی شبلی صاحب! آپ نے اپنی طولانی تحریر
کو ایسے عنوان سے شروع کیا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے
کہ مجھ کو مولوی صاحب کے کام پر اطمینان نہیں (حاشاو
کلا) اگر ایسا ہوتا تو ایسا عظیم الشان کام جو کہ کالج کی
جان ہے، اُن کے سپرد ہرگز نہ کیا جاتا، مجھے اُن پر
بہت بڑا اطمینان ہے، وہ صدہا علمار میں سے اس
جلیل القدر کام کے واسطے منتخب کیے گئے ہیں۔ شاید
آپ کا خیال خرابی یا بے ایمانی کی طرف اس لفظ سے
گیا ہوگا "کہ یہ کام ان کے متعلق کرنا مناسب نہیں"
اس کے یہ معنی ہیں کہ میں کسی طرح ان کے خلاف مرضی
کوئی کام ان کے متعلق کرنا پسند نہیں کرتا، مگر میں
منشی سید احمد صاحب کی معرفت مولوی صاحب
کی مرضی مبارک دریافت کروں گا۔"
سید احمد
۲۲ جنوری سنہ ۱۸۹۵ء ۵۱؎

## مولانا کو نظامت دینیات سے الگ کرنے کی تجویز، اور اس میں ناکامی:

سرسید کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی شعبۂ دینیات میں نہایت بااثر تھے، اور مولف حیات صدر یار جنگ کے الفاظ میں "اس وقت شعبۂ دینیات میں جو کچھ ہوتا مولانا شروانی اور مولانا سلیمان اشرف کی تجویز سے ہوتا" ۵۲؎ لیکن مولانا شروانی مولانا انصاری کی نظامت سے خوش نہیں تھے، اور چاہتے تھے کہ مولانا عبدالماجد بھاگل پوری اس عہدہ کے لیے موزوں شخصیت تھے، صدر یار جنگ نے اس مقصد کے لیے قانونی کوشش شروع کی، ٹرسٹیان کالج کے اجلاس منعقدہ ۳۱ جنوری سنہ ۱۹۰۴ء میں صدر یار جنگ کی تجویز ووٹنگ کے لیے پیش ہوئی، نواب محسن الملک نے اس پر رائے شماری کے وقت، اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ:

"چونکہ یہ نہایت اہم مسئلہ اور ایمان کا معاملہ ہے
اس لیے صاف صاف واقعات اور اپنی اصل رائے
ظاہر کرنا ہر کسی پر لازم ہے، مجھے اس معاملہ میں
پوری واقفیت ہے، اور میرا ذاتی تعلق اس
سے رہا ہے، مولوی بہادر علی اور مولوی حبیب الرحمٰن
شروانی نے مولوی عبدالماجد بھاگل پوری کو ناظم
دینیات کے عہدہ پر مقرر کرنے کا خیال ظاہر
کیا ہے۔" ۵۳؎

بعد میں رائے شماری ہوئی اور صدر یار جنگ کی تجویز ۶ ء کے مقابلہ میں ۲۹ ووٹوں سے مسترد کر دی گئی ۵۴؎ شاید نواب صدر یار جنگ نے اس کی پہلے سے تیاری کی ہوگی، اور ممکن ہے کچھ احباب و ممبران کو ہم نوا بنانے کی کوشش کی ہو، لیکن ٹرسٹیوں نے اپنے اہم مشیروں کا فیصلہ نامنظور کر دیا۔ ٹرسٹیوں کا یہ فیصلہ مولانا انصاری کے علم و فضل کا اعتراف، کالج کی اعلیٰ علمی دینی اخلاقی خدمت و رہنمائی کو خراج تحسین اور مولانا کے کمال خدمت کا مظہر ہے۔

ٹرسٹیان کے مذکورہ بالا اجلاس کے بعد بھی بہت سے لوگوں کو مولانا سے اختلاف رہا ہوگا، اور شعبۂ دینیات پر مولانا کے "تسلّط" کے خلاف آوازیں بلند ہوئی ہوں گی، لیکن مولانا کو نظامت دینیات سے علیٰحدہ کرنے کی کوئی بھی کوشش کامیاب نہیں ہوئی، مولانا تاحیات شعبۂ دینیات کے ناظم اور سربراہ رہے، مولانا کی وفات کے بعد مولانا سلیمان اشرف ناظم دینیات مقرر ہوئے ۵۵؎ مولانا مناظر احسن گیلانی ۵۶؎ اور سید محبوب رضوی ۵۷؎ کا بیان ہے کہ مولانا انصاری کے بعد ان کے صاحبزادے احمد میاں انصاری ناظم شعبۂ دینیات مقرر ہوئے، مگر یہ اطلاع درست نہیں، مولوی احمد میاں اپنے والد کی حیات میں شعبۂ دینیات میں ملازم ہو گئے تھے۔

مگر نظامت دینیات کے لیے کبھی ان کا تقرر، اور انتخاب نہیں ہوا۔

## تحریک ندوۃ العلماء کا تعاون اور رکنیت:

مولانا انصاری ضروریات زمانہ سے واقف، متوازن مزاج اور روشن خیال عالم تھے، ان کو قدیم طرز کے عربی اداروں کو قریب سے دیکھنے برتنے کا موقع ملا تھا اور وہ عرصہ تک اسی طریقے پر درس وافادہ میں مشغول رہے، اور سرسید احمد سے قدیم واقفیت خاندانی مراسم اور علی گڑھ کے قریب (گلاؤٹھی میں) قیام کی وجہ سے ایم۔اے۔او کالج کے متعلق بھی وسیع وکثیر معلومات ہوں گی، اور اس کے سب اچھے برے پہلو نظر میں ہوں گے، بعد میں خود اس ادارہ سے وابستہ ہو گئے، تو اس کو اور زیادہ بہتر طریقے پر سمجھنے کا موقع ملا، مگر افسوس کہ یہ دونوں قسم کے ادارے اور طبقات جو مسلمانوں کی مذہبی، معاشی اور ملکی تنظیم اور تعمیر نو میں ہندی امت مسلمہ کے لیے نمونہ و مثال، اور سفینۂ ملت کے ناخدا تھے ایک دوسرے سے بہت دور، اور بہت بدگمان تھے، علماء اور مصلحین کی یہ کشاکش حساس مسلمانوں کے لیے رنج والم کا سبب بنی ہوئی تھی۔ بہت سے مسلمانوں اور ارباب علم وفکر کی طرح مولانا انصاری بھی دونوں طبقات کی باہمی منافرت، درمیان میں بڑھتے ہوئے فاصلے، اور بداعتمادی کی اس خلیج کو دیکھ رہے تھے جو لمحہ لمحہ گہری اور عمیق ہو رہی تھی۔ مولانا انصاری بھی اس ماحول سے بددل اور اس مرض کے دور کرنے کے لیے کسی تدبیر اور علاج کی فکر میں ہوں گے کہ اسی دوران مجلس ندوۃ العلماء کی تاسیس ہوئی، جو مسلمانوں کے ماضی وحال، مشرق ومغرب، اور قدیم وجدید کے خستہ وشکستہ رشتہ کو استوار کرنے کے لیے امید کی واحد کرن تھی، اور چونکہ اس میں ہر مرکز فکر کے مخلص ارباب علم ودانش جمع ہو گئے تھے، اور سب مل کر ایک قابل قبول حل کی تلاش میں تھے، اس طرح گویا یہ تحریک تمام مسلمانوں کی آواز تھی۔ اس وقت مولانا انصاری کے لیے جو خود اسی مذاق وفکر کے آدمی تھے ممکن نہیں تھا کہ وہ وقت کے ایسے اہم تقاضے سے تغافل برتیں، مولانا نے اس آواز پر لبیک کہا اور تحریک ندوۃ العلماء میں شامل ہو گئے۔

معلوم نہیں اراکین ندوۃ العلماء کا مولانا انصاری سے پہلے سے تعارف اور رابطہ تھا یا وہ اس وقت اس تحریک سے وابستہ ہوئے جب سفیر ندوۃ العلماء مولوی مشتاق حسین علی نگینوی سرسید احمد سے ملاقات کے لیے علی گڑھ آئے، بہرحال مولانا بالکل شروع سے ندوہ کے اراکین میں شامل تھے، مولانا نے ندوہ کے پہلے باقاعدہ اجلاس میں شرکت کے لیے کانپور کا سفر کیا تھا[۵۷] اس سفر میں مولانا شبلی نعمانی، مولانا انصاری کے رفیق تھے[۵۸] ندوہ کے اس اجلاس (منعقدہ شوال سنہ ۱۳۱۱ھ) میں جو تجویزیں منظور ہوئیں ان میں سے ایک اہم تجویز اصلاح نصاب کی تھی، نصاب پر غور وفکر کے لیے بارہ اراکین پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل ہوئی۔ مولانا انصاری اس کے اہم ممبر تھے۔ نئے نصاب کی تشکیل موزوں کتابوں کا انتخاب، اس کے نفاذ کی تدبیریں، متوقع فوائد، نقصانات کے اندیشے، اہل مدارس اور تعلیمی حلقوں میں اس پر اعتراضات اور نئے خدشات ہر ایک عنوان اہمیت کا حامل اور غور وفکر کا محتاج تھا، نصاب سے متعلق ایک ایک عنوان، اور اس کے ایک ایک پہلو اور شق پر مختلف نشستوں میں بار بار غور وفکر ہوا ہوگا، جس کی وجہ سے ترتیب نصاب کے عمل میں بہت وقت صرف ہوا، مولانا غالباً آخر تک اس میں شریک رہے مولانا کی آراء (جن کی تفصیلات اور معنویت ہماری نظر میں نہیں ہے) اراکین ندوۃ العلماء کی نظر میں بہت اہم اور باوزن ہوں گی، اور یہی وجہ ہے کہ مولانا اس منصوبہ کی تکمیل کے بعد بھی ندوہ میں نصاب سے متعلق کمیٹیوں کے رکن مقرر ہوئے، جمادی الآخر سنہ ۱۳۱۷ھ میں ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ نے مجلس نصاب تعلیم دارالعلوم مقرر کی، مولانا انصاری اس میں بھی شامل کیے گئے۔[۵۹]

مولانا انصاری ندوہ کے سالانہ جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے، دوسرے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ ۱۳۱۲ھ/اپریل ۱۸۹۵ء میں شرکت کی، اور اس کی مجالس میں مختلف

حیثیات سے سرگرم رہے، تقریر بھی کی، اسی اجلاس میں ندوہ کا دستور منظور ہوا اور مولانا مجلس انتظامیہ کے رکن مقرر کیے گئے، تیسرے چوتھے سالانہ جلسے میں بھی شریک ہوئے[۶۰] اس کے بعد کسی اور جلسے میں موجودگی کی اطلاع پیش نظر ماخذ تاریخ ندوۃ العلماء میں درج نہیں، تاہم مولانا تاحیات ندوہ کی مجلس انتظامی کے رکن رہے، ظاہر ہے کہ سالانہ جلسوں میں بھی آتے ہوں گے، لیکن اس کی تفصیلات میرے سامنے نہیں ہیں۔

ندوہ کے بیسویں سالانہ جلسے منعقدہ انبالہ سنہ ۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۵ء میں مولانا کی وفات پر قرارداد تعزیت پیش ہوئی، اراکین ندوۃ العلماء نے اپنے ایک اہم معاون و شریک کار کی وفات پر دلی رنج و غم کا اظہار کیا، دعائے مغفرت سے نوازا، اور ندوہ کے لیے مولانا کے تعاون اور مخلصانہ جذبات کو خراج تحسین پیش کیا[۶۱]

## سیاسی نظریات و خدمات:

مولانا انصاری کو خاندانی اور روحانی سلسلے میں ایسے افراد سے نسبت حاصل تھی جو فرنگی حکومت کے مخالف تھے، اور فدائیانِ حریت کے اس ہراول دستہ میں شامل تھے جو سنہ ۱۸۵۷ء میں شاملی اور تھانہ بھون میں ایک پرجوش منظم جنگ کی قیادت کر چکا تھا، مولانا کو ان کا یہ جذبہ اور آزادی کی تڑپ ورثہ میں ملی، اور یہ رنگ ایسا گہرا اور پختہ ہو گیا تھا کہ سرسید احمد کی طویل رفاقت، اور ایم۔اے۔او۔ کالج میں تقریباً تہائی صدی گزارنے کے بعد بھی اس میں کوئی کمزوری نہیں آئی، مولانا علی گڑھ کی مصروفیات اور دوسرے قومی مشاغل کی وجہ سے کالج سے باہر ملک کی عملی سیاست میں سرگرم، اور شاید حسب دل خواہ حصہ نہیں لے سکتے تھے لیکن وہ آزادی وطن کے لیے سیاسی تحریکات کی حمایت، اور ان کی پوری حوصلہ افزائی کرتے رہے ـــــ برطانوی خفیہ محکمہ "C.I.D." کی اطلاع ہے کہ مولانا انصاری نے سنہ ۱۹۱۳ء میں برطانوی مال کے مقاطعہ (۵۰۶، ۵۲۲) کے فتوے پر دستخط کیے تھے، مگر بعد میں ایک بیان کے ذریعہ یہ حمایت واپس لے لی تھی[۶۲]

ہندوستان کی آزادی کے لیے جو جماعتیں کام کر رہی تھیں ان میں ایک اہم اور بہت منظم جماعت شیخ الہند مولانا محمود حسن کے شاگردوں اور مخلصین کی تھی، جو ترکی اور افغانستان کا تعاون لیکر ہندوستان پر مسلط انگریز حکومت کے خلاف فوجی اقدام کرنا چاہتے تھے، بعد میں یہ تحریک ریشمی رومال تحریک کے نام سے موسوم ہوئی ـــ اور تحریک کے مقاصد کو روبعمل لانے کے لیے فوجی دستوں کی تشکیل ہوئی اور ایک نظام جنگ مرتب کیا گیا تھا، اس لشکر کے قائدین نے میجر جنرل کے عہدہ کے لیے صرف تین نام منتخب کیے تھے، اس میں تیسرا نام مولانا انصاری کا ہے، اگرچہ تحریک کا راز کھل جانے کی وجہ سے فوجی اقدام کا موقع ہی نہیں آیا، لیکن ایسے جرأت مندانہ اور نہایت خطرناک مقاصد کی ترتیب و تشکیل کے وقت ایک ایسے اہم اور نازک عہدہ پر مولانا کے انتخاب کے تقرر کی وجہ سے بہت آسانی کے ساتھ یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مولانا انصاری حضرت شیخ الہند کے کتنے قریب، آزادی کے لیے کس قدر متحرک و فعال اور اس وقت کے سیاسی کارکنوں کی نظر میں کتنے با اعتماد تھے، جو اس عہدہ کے لیے موزوں سمجھے گئے۔

ریشمی خطوط سازش کھل جانے کے بعد حضرت شیخ الہند اور ان کے بعض قریبی رفقاء گرفتار ہوئے، دوسرے کارکنوں پر بھی مختلف صورتوں میں عتاب ہوا، اس کے بعد سے یہ سب لوگ جو شیخ الہند کے معاون و رفیق تھے حکومت کی نظر میں "خطرناک" قرار پائے، اور ان کے مختصر احوال و کوائف سے واقفیت، اور ان پر ہر وقت نظر رکھنے میں مدد دینے کے لیے حکومت کی جانب سے افسروں کے لیے ایک "خفیہ" تعارفی کتابچہ شایع ہوا تھا، اس میں مولانا انصاری کا ان الفاظ میں تذکرہ ہے:

• ایم۔ عبداللہ انصاری ـــ ضلع سہارن پور، صوبہ جات متحدہ کا باشندہ ہے، ایم اے او

کالج میں وہ ناظم دینیات رہا ہے۔ اس کی طرف سنہ ۱۹۱۳ء میں توجہ ہوئی، جب کہ اس نے یورپین مال کے بائیکاٹ کے نفضل الحسن حسرت موہانی کے فتوے پر دستخط کیے، بعد میں اخبارات کو ایک خط کے ذریعے اس نے فتویٰ کی حمایت کو واپس لے لیا۔ جنود ربانیہ کی فہرست میں وہ میجر جنرل ہے۔ ۶۳

مولانا کے انقلابی خیالات اور سیاسی جدوجہد کالج کی انتظامیہ سے ڈھکی چھپی نہ ہوگی، مگر ہمیں معلوم نہیں کہ کالج کی انتظامیہ نے اس پر کیا ردعمل ظاہر کیا، مولانا سے جواب طلبی ہوئی، فہمائش کا پروانہ جاری کیا گیا، یا سب کچھ صبر و سکون سے دیکھتے رہے۔ خیال ہے کہ اگر کچھ کارروائی ہوئی ہوگی تو وہ شاید بڑی حد تک غیر موثر رہی ہوگی مولانا کی مقبولیت اور ان کی ذات پر طلبہ اور ٹرسٹیان کے اعتماد نے مولانا کو خاص عزم و حوصلہ بخشا ہوگا، اور مولانا نے اس اعتماد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے طلبہ میں باغیانہ خیالات اور سیاسی جذبات کی پرورش میں خاص حصہ لیا ہوگا، مگر سیاسی افق پر مولانا کے بہت نمایاں نہ ہونے کی وجہ سے اس خدمت کا چرچا اور تعارف نہیں ہوا۔

## تحریر و تصنیف :

مولانا انصاری اپنی درسی اور انتظامی مصروفیات کی وجہ سے تصنیف و تالیف کی جانب غالباً بہت کم توجہ کر سکے، مولانا کی کوئی ایسی مطبوعہ تحریر جس کو باقاعدہ تصنیفات میں شمار کیا جائے، راقم سطور کے علم و نظر میں نہیں ہے۔ سلوک و تصوف کے موضوع پر مولانا کی ایک اردو مثنوی "درد پنہانی" کے نام سے مولانا کی حیات میں چھپی تھی۔ اس کا ایک نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں محفوظ ہے، مگر راقم سطور کو اس سے استفادہ کا موقع نہیں ملا۔

ایک اور اہم علمی خدمت مثنوی مولانا روم پر حاشیہ لکھنے، اور نئی طباعت کے لیے مثنوی کے متن کی تصحیح و ترتیب تھی، مولانا اس مقصد کے لیے مکہ مکرمہ سے حضرت حاجی امداد اللہ کا مثنوی کا ذاتی نسخہ لے کر آئے تھے، جس پر حاجی صاحب کے افادات، اور تمام عمر کی تحقیقات درج تھیں، اور اس کی تکمیل میں مصروف رہے، یہ کام غالباً سنہ ۱۳۰۸ھ میں سفر حج کے بعد شروع ہوا، اور سنہ ۱۳۱۱ھ میں علی گڑھ میں تقرر کے وقت تک اس میں مشغول تھے، مگر غالباً یہ کام مکمل نہیں ہوا، اور اس کی طباعت بھی نہیں ہوئی۔ ۶۴

## تقریر و خطابت :

مولانا انصاری کو زمانۂ طالب علمی میں تقریر و خطابت کی مشق ہوگئی تھی، اس کا غالباً پہلا نمونہ اس وقت سامنے آیا جب حضرت نانوتوی رمضان المبارک کے ہفتہ واری وعظ کے معمول میں کسی وجہ سے شرکت نہیں فرما سکے، اور اپنی نیابت اور نمائندگی کے لیے مولانا انصاری کا انتخاب کیا جو اس وقت نوعمر، اور عربی کے متوسط جماعت کے طالب علم تھے، اس واقعہ کی تفصیل خود مولانا کی زبانی سنیے :-

> "حضرت (مولانا محمد قاسم) کی عادت تھی کہ ماہ رمضان المبارک میں جب نانوتہ میں قیام تھا تو ہر جمعہ کو بلاناغہ وعظ فرمایا کرتے تھے، کوئی ایک آیت یا روایت اختیار فرمالیتے، اور اسی کے علوم و معارف پورے رمضان بیان ہوتے رہتے تھے۔ میں نانوتہ میں ایک رمضان میں حاضر تھا اور پورے رمضان مقیم رہا۔ اس رمضان میں حضرت نے حدیث من صام رمضان ایمانا و احتسابا غفرلہ ما تقدم من ذنبہ کو اختیار فرمایا اور مسلسل تین جمعوں میں اسی کا بیان فرماتے رہے آخری جمعہ میں کچھ طبیعت ناساز ہوگئی تو مجھ سے فرمایا کہ "مولوی عبداللہ! اس جمعہ میں تو تم اسی حدیث کے سلسلے میں بیان کر دو"۔ میں شرح جامی پڑھتا تھا۔ میں نے عرض کیا میں تو حدیث کے مدلول کو سمجھنے کی ہی اہلیت نہیں رکھتا، تقریر و بیان تو

کیا کروں گا۔ فرمایا: بھائی! اللہ پہ بھروسہ کرکے تم کھڑے ہو جانا خدا مدد فرمائے گا۔[۶۵]

مولانا انصاری نے حضرت کی نیابت میں اس حدیث شریف پر دو ڈھائی گھنٹے تقریر کی، اور علوم و نکات بیان کیے۔ مولانا نے اپنے اس واقعہ کا حضرت نانوتوی کی روحانی قوت کے نمونہ یا کرامت کی حیثیت سے تذکرہ کیا ہے، مگر بلاشبہ اس کے پس منظر میں حضرت نانوتوی کی بصیرت اور مولانا انصاری کی علمی لسانی صلاحیت اور قوت خطابت سے واقفیت اور اس پر اعتماد صاف نظر آرہا ہے کیونکہ ——— دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر!

## ازدواج و اولاد:

مولانا عبد اللہ انصاری، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے داماد تھے، مولانا کی صاحبزادی اکرام النساء (بی اکرامًا) مولانا انصاری سے منسوب ہوئیں۔ یہ تقریب بہت سادہ اور مسنون طریقے پر سرانجام پائی۔ حضرت مولانا نے اپنی چہیتی بیٹی کو انہی معمولی سادہ کپڑوں میں جو وہ نکاح کے وقت پہنے ہوئے تھیں، شوہر کے ساتھ رخصت کر دیا۔[۶۶] ان سے دو بیٹے، مولانا محمد میاں عرف منصور انصاری، احمد میاں انصاری اور تین بیٹیاں یادگار تھیں۔

مولانا محمد میاں منصور انصاری دارالعلوم دیوبند کے فارغ، جید فاضل، اور نامور سیاسی رہنما تھے، مولانا نے آزادی کی جدوجہد میں بہت سرگرم حصہ لیا۔ ریشمی رومال تحریک کے صفِ اول کے قائد اور منصوبہ ساز بزرگ تھے، اسی سلسلہ میں ہندوستان سے ترک وطن کرکے افغانستان گئے، اور تاحیات شیخ الہند کے مقاصد کے لیے کام کرتے رہے، اسی خود گرفتہ جلاوطنی میں ۸ صفر سنہ ۱۳۶۵ھ/ ۱۳ اپریل ۱۹۴۶ء کو کابل میں وفات پائی۔ متعدد، پایہ بلند تصنیفات، اور ایک صاحبزادہ مولانا حامد الانصاری غازی یادگار ہیں۔

مولانا احمد میاں کے متعلق معلومات بہت کم دستیاب ہیں۔ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی عالم فاضل شخص تھے ۱۳۲۹ھ میں پپھاڑ (؟) میں مدرس تھے،[۶۸] بعد میں شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں مدرس و ملازم ہوئے۔ مولانا گیلانی اور سید محبوب رضوی نے لکھا ہے کہ وہ مولانا عبد اللہ انصاری کے بعد ناظم دینیات مقرر ہوئے، مگر یہ اطلاع صحیح نہیں، تفصیلات اوپر گزر گئی ہیں۔

## وفات:

مولانا عبد اللہ انصاری کی تقریباً سنہ ۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۵ء میں بمبئی میں وفات ہوئی، مولف نزہۃ الخواطر کا قول ہے:

"مات فی نحو اربع و اربعین و ثلاث مائۃ و الف فی بومبائی"۔ (تقریباً سنہ ۱۳۴۴ھ میں بمبئی میں وفات ہوئی۔)

لیکن جناب سید محبوب رضوی نے اس اطلاع کی تردید کی ہے، اور لکھا ہے:

"نزہۃ الخواطر جلد ہشتم میں ان (مولانا انصاری) کا سال وفات سنہ ۱۳۴۴ھ لکھا ہے، جو درست نہیں ہے۔ اگرچہ ان کے انتقال کا صحیح سنہ معلوم نہیں ہو سکا مگر اتنی بات یقینی ہے کہ سنہ ۱۳۴۴ھ سے بہت پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ انبہٹہ میں اپنے آبائی قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔"[۶۹]

مگر دستیاب شواہد مولانا عبد الحی حسنی کی روایت کی تائید کر رہے ہیں، جناب محبوب رضوی کو مغالطہ ہوا، یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ مولانا انصاری سنہ ۱۳۳۹ھ تک حیات تھے، اس وقت کے متعدد مضامین اور رسائل کے حوالہ جات میں مولانا کا ایک زندہ و موجود شخص کی حیثیت سے تذکرہ ہے، اور اوپر گزر گیا ہے کہ مولانا انصاری تحریک ندوۃ العلماء کے رکن تھے اور آخر تک رہے، ندوۃ العلماء کے بیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ ۱۱-۱۲ جمادی الاخریٰ سنہ ۱۳۴۴ھ/ ۲۸-۲۹ نومبر سنہ ۱۹۲۵ء میں مولانا کی وفات پر قرارداد تعزیت پیش ہوئی، جس کے الفاظ درج ذیل ہیں:

"یہ جلسہ اپنے دلی رنج و غم کا اظہار مولوی عبد اللہ صاحب

انصاری، ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی کی رحلت پر
کرتا ہے، مرحوم ابتدا سے ندوۃ العلمار کے ارکان
اور ہمدردوں میں شامل تھے، اور دعا کرتا ہے کہ
اللہ تعالیٰ مرحوم کو غریق رحمت فرمائے"۔ [۱۰]

مولف 'نزھۃ الخواطر' ندوۃ العلمار کے رکن' اور دارالعلوم ندوۃ العلمار کے ناظم تھے ان کا مولانا انصاری سے ہمہ وقت رابطہ اور مراسلت رہتی ہوگی، ناممکن ہے کہ مولانا عبدالحیٔ حسنی کو ان کا صحیح وفات اور مدفن معلوم نہ ہو۔ مولانا حسنی کی تحریر سے قطع نظر ارکین ندوۃ العلمار کو کیا ہوا تھا، وہ کیوں مولانا کی وفات سے بے خبر رہے، اور "کئی سال بعد" قرار داد تعزیت پیش کی۔ ظاہر ہے کہ ایسے ذی علم، باخبر ارباب علم و فکر سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ برسوں کے بعد کسی کی قرار داد تعزیت پیش کریں۔ صحیح یہ ہے کہ یہ قرار داد بر وقت تھی اور مولانا حسنی کی اطلاع بالکل صحیح ہے، جناب محبوب رضوی کو سخت مغالطہ ہوا حالانکہ ان کو معلومات کے زیادہ بہتر، مستند اور وسیع ذرائع حاصل تھے۔

---

# حواشی :

۱۔ یہ معلومات تحفۂ صادقیہ، مولانا مشتاق احمد صاحب انبہٹوی صـ۲ ( ۱۳۲۹ھ) اور تذکرۃ الخلیل، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی صـ۲۸ (سہارن پور: ۱۳۹۵ھ) سے ماخوذ ہیں۔

۲۔ تحفۂ صادقیہ (نسب نامہ انصاریان انبہٹہ) مرتبہ و مولفہ: مولانا مشتاق احمد انبہٹوی صـ۱۶ ( ۱۳۲۹ھ) مولف تحفۂ صادقیہ نے مولانا عبداللہ انصاری کا شجرہ اس تحریر کے حوالہ سے درج کیا ہے جو مولانا انصاری نے نسب نامہ میں شامل کرنے کے لیے ارسال کی تھی، اس میں مولانا نے خالد بن زید کے بعد یہ اسمار ذکر فرمائے ہیں: " ابن عبد مناف بن غنم بن حبیب بن صاحب ابن ..... ہاشم" مگر مولانا کا یہ ارشاد صحیح نہیں، حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا صحیح سلسلۂ نسب اس طرح ہے: "خالد بن زید بن کلیب' بن ثعلبہ، بن عبد عمرو' بن غنم، بن مالک، بن النجار، بن ثعلبہ بن الخزرج" رک: سیر اعلام النبلاء، علامہ شمس الدین الذھبی ص ٤٠٢ ج ۲ ( بیروت ۱٤٠٢ھ) مولانا خلیل احمد نے بھی اپنی ایک تحریر میں مولانا انصاری کی اس فروگزاشت پر توجہ دلائی ہے تحریر ہے:

"مولوی عبداللہ بن مولوی انصار علی نے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا نسب نامہ اوپر تک لکھا ہے اس میں صرف زید تک تو صحیح ہے، اور مابعد زید جو عبد مناف بن غنم بن حبیب بن عباس صاحب... ہاشم لکھا ہے، غلط ہے" ــــ خلیل احمد

حضرت مولانا کی یہ تحریر مولانا کے مملوکہ نسخہ تحفۂ صادقیہ پر ثبت ہے، جو کتب خانہ مظاہر علوم، سہارن پور میں محفوظ ہے۔

۳۔ حالات مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم۔ از مولانا محمد یعقوب نانوتوی صـ۱۳ ( بھاول پور: ۱۲۹۷ھ)

۴۔ اس سلسلے کی مزید معلومات کے لیے دیکھیے: تذکرۃ الخلیل (سوانح مولانا خلیل احمد انبہٹوی)، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی صـ۳۲ صـ۳۳۔

۵۔ تذکرۃ الخلیل صـ۳۳

۶۔ حوالۂ مذکور صـ۳۸

۷۔ کتاب مذکور صـ۳۵

۸۔ تحفۂ صادقیہ صـ۱۵

۹۔ بیاض یعقوبی، حکیم امیر احمد عشرتی صـ۹۱ ( تھانہ بھون: بلا سنہ)

۱۰۔ نزہت الخواطر۔ مولانا عبدالحیٔ صـ۲۸۵۔ جلد ۸

۱۱۔ مولانا احمد علی، کلکتہ کی ملازمت ترک کرکے سنہ ۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۴ء سہارن پور واپس آ گئے تھے، مولانا کے نسبتہ

مفصل حالات کے لیے رجوع فرمایئے "ضمیمہ امداد المشتاق" حضرت حاجی امداد اللہ کے اساتذہ" از نور الحسن راشد (دہلی: ۱۹۸۳ء)

۱۲۔ نزہۃ الخواطر ص۴۵ ج ۸۔

۱۳۔ ملاحظہ ہو: مکتوب حضرت حاجی امداد اللہ بنام مولانا فتح محمد تھانوی جلال آبادی، مورخہ ربیع الاول ۱۳۰۵ھ یہ خط ہمارے ذاتی ذخیرہ میں محفوظ ہے۔ اس کے مکمل متن کے لیے مطالعہ فرمایئے: راقم سطور کا مضمون "عرفان امداد" ماہنامہ الفرقان لکھنؤ اپریل ۱۹۷۹ء۔

۱۴۔ مکاتیب رشیدیہ، مرتبہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ص۹۰ ص۹۱ (طبع اول: میرٹھ، بلا سنہ)

۱۵۔ دار العلوم دیوبند کی صد سالہ زندگی۔ مولانا قاری محمد طیب ص۵۸ (دیوبند: ۱۳۸۵ھ)

۱۶۔ اقوال الصالحین، مرتبہ مولانا محمد سلیم عثمانی کیرانوی ص۳ (کراچی: ۱۳۹۱ھ)

۱۷۔ انوار العاشقین ص۸۹ طبع اول (حیدر آباد: ۱۳۳۲ھ) نیز ملاحظہ ہو: تحفہ صادقیہ ص۷

۱۸۔ مکتوب مولانا محمد یعقوب بنام منشی محمد قاسم نیانگری، بلا تاریخ کتابت، شامل بیاض یعقوبی ص۹۳ (تھانہ بھون: بلا سنہ)

۱۹۔ تاریخ دار العلوم، دیوبند ص۱۸۶ (ساہیوال: ۱۴۰۰ھ)

۲۰۔ ملاحظہ ہو حوالہ بالا بیاض یعقوبی ص۹۳

۲۱۔ بیاض یعقوبی، مرتبہ حکیم امیر احمد عشرتی، مکتوب مولانا محمد یعقوب ص۴۶ بیاض یعقوبی ص۱۴۷

۲۲۔ مکتوب مولانا محمد یعقوب ص۳، مجموعہ مکتوبات بنام حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی رح جس میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد یعقوب کے خطوط شامل ہیں۔ یہ تمام خطوط غیر مطبوعہ ہیں (فوٹو اسٹیٹ مملوکہ راقم سطور)

۲۳۔ ظلّ صفۃ (حالات مدرسہ امداد العلوم، تھانہ بھون) مولانا عبد اللہ گنگوہی ص۲۲ (ساڈھورہ: ۱۳۳۰ھ)

۲۴۔ مکتوبات سرسید مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی ص۲۶۹ ج ۱ (لاہور: ۱۹۷۶ء)

۲۵۔ برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ اشتیاق حسین قریشی ترجمہ ہلال احمد زبیری ص۲۹۰ (کراچی: ۱۹۸۳ء)

۲۶۔ اسباب بغاوت ہند۔ سرسید احمد۔ مرتبہ: فوق کریمی ص۱۰۸ (دہلی: ۱۹۷۱ء)

۲۷۔ تاریخ التعلیم۔ میجر بی۔ ڈی باسو۔ ترجمہ: وارث سرہندی ص۱۴۶ (کراچی: ۱۹۷۶ء)

۲۸۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر۔ ترجمہ ڈاکٹر صادق حسین ص۲۱۳ (لاہور: ۱۹۴۴ء) مولانا الطاف حسین حالی بھی اس اطلاع کی تصدیق کرتے ہیں، حیات جاوید ص۲۱۳ (دہلی: ۱۹۸۲ء)

۲۹۔ تحریر انگلیس مولانا کی حیات میں دو مرتبہ چھپی، معلومات اور دتاسی کے حوالہ کے لیے دیکھیے: ایک نادر مجموعہ مکاتیب، محمد اکرام چغتائی، قسط اول، بذیل مکتوبات مولانا مملوک العلی سہ ماہی اردو۔ کراچی ص۳۶ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۴ء)

۳۰۔ مولانا آزاد کی کہانی، مولانا آزاد کی زبانی، عبد الرزاق ملیح آبادی ص۲۶۲ (کلکتہ: ۱۹۵۸ء)

۳۱۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، مولانا مناظر احسن گیلانی ص۳۹ ص۴۰ ج ۲ طبع اول (حیدر آباد، بلا سنہ)

۳۲۔ تذکرہ مولانا محمد احسن نانوتوی، از پروفیسر محمد ایوب قادری ص۱۵۲ (کراچی: ۱۹۶۶ء)

۳۳۔ تواریخ عجیب یعنی کالا پانی۔ محمد جعفر تھانیسری۔ مقدمہ پروفیسر ایوب قادری ص۴۳ (کراچی: ۱۹۶۲ء)

۳۴۔ تذکرۃ الخلیل، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ص۱۱ ص۱۲ (سہارن پور: ۱۳۹۵ھ)

۳۵۔ فتاویٰ رشیدیہ۔ مرتبہ مولوی عزیز الدین مراد آبادی

ص ۹۱ ، ص ۹۰ حصہ اول ، طبع اول (مراد آباد : ۱۳۲۳ھ) یہ
فراموش نہیں ہونا چاہیئے انگریزی پڑھنے کی اجازت، اور
سرسید احمد کے نظریات سے اتفاق و اختلاف دو
بالکل الگ الگ چیزیں ہیں ۔ سرسید احمد کے متعلق حضرت
گنگوہی کے فتوی سے مراجعت کے لیے دیکھیے: نصرۃ الابرار
مرتبہ مولوی محمد لدھیانوی ص ۲۴ طبع دوم (لدھیانہ ۱۹۴۵ء)

۳۶ ۔ فتاوی مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی ص ۲۷ ج ۲ ، (لکھنؤ ۱۳۳۰ھ)

۳۷ ۔ تذکرۃ الرشید ۔ مولانا عاشق الہی میرٹھی ص ۵۰ ج ۲

۳۸ ۔ مکتوبات سرسید ۔ مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ص ۹۰-۹۱
ج ۱ ؛ (لاہور : ۱۹۷۶ء)

۳۹ ۔ مکتوبات سرسید ص ۱۳۵ ج ۱ ؛ اس موضوع پر سرسید کی
مزید تحریرات کے لیے دیکھیے ۔ مکتوبات سرسید ص ۲۲۵ ،
ص ۲۲۶ ، ص ۲۲۷ ج ۱ ؛

۴۰ ۔ تصفیۃ العقائد (مراسلت حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی
و سرسید احمد) ص ۶ (مراد آباد : ۱۳۰۴ھ) یہ مراسلت
حضرت مولانا سے سرسید کی اس خط و کتابت کے علاوہ
ہے جس کا سرسید ، حالی ، اور مولوی محمد امین مارہروی
نے تذکرہ کیا ہے ۔ سنی دینیات کی رکنیت کے لیے حضرت
مولانا محمد قاسم اور مولانا یعقوب کو سرسید نے جو خط لکھا تھا
اس کے جواب کے متن کے لیے ملاحظہ ہو:
تذکرہ سرسید ۔ مولوی محمد امین زبیری ص ۷۱ (پبلشرز
یونائیٹڈ لمیٹڈ ۔ لاہور ۔ بلاسنہ)

۴۱ ۔ مکتوبات سرسید ص ۳۰۲ ۔ ج ۱ ؛

۴۲ ۔ مکتوبات سرسید ص ۲۶۹ ۔ ج ۱

۴۳ ۔ نزہۃ الخواطر ۔ مولانا عبدالحیٔ حسنی ۔ ص ۲۸۵ ج ۸

۴۴ ۔ اعمال نامہ ، سر رضا علی ص ۱۳۹ (دہلی : ۱۹۴۳ء)

۴۵ ۔ وقار حیات (سوانح نواب وقار الملک) مولوی اکرام اللہ
خان ندوی ص ۵۴۳ (کراچی : ۱۹۸۴ء)

۴۶ ۔ امداد الفتاوی (مجموعہ فتاوی حکیم الامت مولانا اشرف علی
تھانوی) ص ۲۵۶ ۔ ج ۴ ۔ (طبع اول کراچی : بلاسنہ)
امداد الفتاوی میں خط لکھنے والے کا نام درج نہیں مگر
کتاب کے اسی صفحہ پر نواب حبیب الرحمن خاں شروانی
صدر یار جنگ کا بھی ایک خط منقول ہے اس میں تحریر ہے:
جناب مولوی صاحب ناظم دینیات نے بھی اس بارہ میں
آپ کو لکھا ہوگا" اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ
مذکورہ بالا خط مولانا انصاری کا لکھا ہوا ہے ۔

۴۷ ۔ تذکرہ محسن (حالات نواب محسن الملک) مرتبہ ۔ مولوی
محمد امین زبیری ص ۱۲۴ (دہلی : ۱۳۵۳ھ)

۴۸ ۔ یہ تمام معلومات تذکرہ محسن سے ماخوذ ہیں ۔ ملاحظہ ہو:
ص ۱۲۲ تا ص ۱۲۹ ۔ نیز دیکھیے اعمال نامہ ۔ سر رضا علی ص ۱۳۸

۴۹ ۔ ضمیمہ تذکرہ محسن ص ۱۰ ص ۱۱

۵۰ ۔ صدر یار جنگ ، مولوی شمس تبریز خاں ص ۱۶۷ (لکھنؤ:
۱۳۹۲ھ) علامہ شبلی کا یہ خط " مکاتیب شبلی " علامہ
سید سلیمان ندوی ۔ (اعظم گڑھ : ۱۹۲۸ء) میں شامل نہیں ہے ۔

۵۱ ۔ مکتوبات سرسید ص ۳۰۱ ۔ ۳۰۲ ۔ ج ۱

۵۲ ۔ صدر یار جنگ (سوانح نواب حبیب الرحمن خاں شروانی)
مولوی شمس تبریز خاں ص ۱۶۸ (لکھنؤ : ۱۳۹۲ھ)

۵۳ ۔ صدر یار جنگ ص ۱۶۷ ص ۱۶۸

۵۴ ۔ صدر یار جنگ ، صفحۂ مذکورہ بالا

۵۵ ۔ صدر یار جنگ ص ۱۶۸

۵۶ ۔ سوانح قاسمی ۔ مولانا مناظر احسن گیلانی ص ۵۰۵ ج ۱
(دیوبند : ۱۳۹۵ھ)

۵۷ ۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند ص ۱۸۶ (ساہی وال : ۱۴۰۰ھ)

۵۸ و ۵۹ ۔ یادگار شبلی ۔ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام ص ۱۱۹
(لاہور : ۱۹۷۱ء) نیز ملاحظہ ہو : ذکر شبلی ۔ مولوی
محمد امین زبیری ص ۷ (لکھنؤ : ۱۹۴۶ء)

۶۰ ۔ تاریخ ندوۃ العلماء ۔ مولانا اسحاق جلیس ندوی ص ۱۰۷ ۔

۶۴۔ اس کے متعلق معلومات اور حضرت حاجی امداد اللہ کے خطوط وغیرہ کی تفصیلات کے لیے دیکھیے: مکاتیب رشید صـ۵ صـ۹ (میرٹھ : )

۶۵۔ سوانح قاسمی، مناظر احسن گیلانی ص ۴۴۳ - ج ۱
مولانا کی تقریر کے ایک چھوٹے سے نمونہ کے لیے دیکھیے تاریخ ندوۃ العلماء صـ۱۱۲ ج ۱
نیز دیکھیے کتاب مذکور ص ۱۱۲ - ۱۲۶ - ۱۲۹ وغیرہ ج ۱
(لکھنؤ: ۱۴۰۳ھ)

۶۱۔ تاریخ ندوۃ العلماء۔ جناب شمس تبریز خاں ص ۳۰ ج ۲
(لکھنؤ: ۱۴۰۴ھ)

۶۲۔ تحریک شیخ الہند (ریشمی خطوط سازش کیس) سی آئی ڈی رپورٹ۔ ترجمہ جناب رفیق عزیز بیگ، مرتبہ مولانا محمد میاں صـ۲۷۵ (دہلی: ۱۳۹۵ھ)

۶۳۔ تحریک شیخ الہند (ریشمی رومال سازش کیس) صـ۲۰۳

۶۴۔ سوانح قاسمی صـ۵۴۵، ج ۱

۶۷۔ روزنامچہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی۔ اس تاریخ اور سید محبوب رضوی کی بیان کردہ تاریخ میں دو روز کا فرق ہے (تاریخ دارالعلوم صـ۲۰۵) ہمیں اول الذکر پر اعتماد ہے، وہ اسی وقت کی تحریر ہے۔

۶۸۔ نزہۃ الخواطر، مولانا عبدالحئی حسنی۔ ص ۲۸۶۔ ج ۸

۶۹۔ تاریخ دارالعلوم صـ۱۸۵ (ساہی وال : ۱۴۰۰ھ)

۷۰۔ تاریخ ندوۃ العلماء، صـ۲۹۸، ج ۲۔



شش ماہی فکر و نظر علی گڑھ

جلد: ۲۳ ۱۹۸۶ء

# ناموران علی گڑھ

دوسرا کارواں

مدیر: نور الحسن نقوی

مدیر معاون: محمد صابر

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

# دوسرا کارواں

